ڈاکٹر ابرار عبدالسلام
صدرِ شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج سول لائنز، ملتان

مومن خان مومن کے حالات میں پہلا مضمون

Dr. Abrar Abdus Salam

Chairman, Department of Urdu, Govt. College Civil Lines, Multan

Abstract: Momin Khan Momin is one of the greatest poets of 19th centuary. He composed poetry in Urdu as well as Persian. He expressed his ideas and experiences in almost all poetic generes. He was a hakeem (physician) by profession. His clinic was the centre of all sorts of cultrual and litrary activities in Delhi. He belonged to Shah Waliullah's school of thought. He was a great promoter of Tehreek e Mujahideen. He wrote some poetry in the favour of Tehreek e Mujahideen. This paper is based on the discovery of an article believed to be the first on the life and works of Momin Khan Momin. This earliest article on Momin was published in different litrary magazines of the Subcontinent. In the present paper, the author has introduced, edited and annotated it.

انیسویں صدی کے وسط میں دہلی میں باکمال شعرا کا ایک ایسا گروہ جمع ہو گیا تھا، جن کے باعث اردو ادب پر بالعموم اور اردو شاعری پر بالخصوص گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس گروہ میں: شاہ نصیر، غالب، ذوق، ظفر، شیفتہ، آزردہ، نسیم دہلوی، سالک، ظہیر، مجروح اور داغ اہمیت کے حامل شعرا ہیں۔ ان میں ایک اہم نام مومن خان مومن کا بھی ہے۔ مومن کی اہمیت اور شاعرانہ عظمت کو ان کے ہم عصر شعرا اور تذکرہ نگاروں نے نہ صرف تسلیم کیا، بلکہ ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان بھی رہے۔ مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ یہی صنف ان کی شناخت بنی۔ ان کی غزل گوئی کا امتیازی وصف تغزل تھا اور تغزل کی اسی انفرادیت نے انھیں ان کے معاصرین اور ان کے بعد کے شعرا میں ممتاز و منفرد مقام سے سرفراز کیا۔

مومن کے معاصر تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ترجمہ شامل کیا ہے۔ یہی نہیں **آبِ حیات** سے آج تک لکھی گئی تمام تاریخیں انھیں نظر انداز نہ کر سکیں۔ یہ مومن کی انفرادی شان ہی تھی، جس کے باعث ان کے عہد سے آج تک کے تمام لکھنے والے انھیں فراموش نہ کر سکے۔ اگرچہ **آبِ حیات** کا پہلا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۸۰ء مومن کے ترجمے سے خالی رہا، لیکن عوام کی پُرزور فرمائش اور احتجاج نے آزاد کو **آبِ حیات** کی دوسری اشاعت مطبوعہ ۱۸۸۳ء میں معذرت خواہانہ رویہ اپنانے اور مومن کا ترجمہ شامل کرنے پر مجبور کر دیا۔[۱] **آبِ حیات** کی اشاعت اکتوبر، نومبر ۱۸۸۰ء میں ہو چکی تھی۔[۲] اس کتاب کی اشاعت کے فوری بعد اس پر تبصرے اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں آزاد کی حمایت اور مخالفت دونوں طرح کے مضامین شائع ہوئے۔ آزاد کی

مخالفت میں لکھے گئے مضامین نے آزاد کے ساتھ ساتھ ادبی فضا کو بھی خاصا مکدر کیا۔ اسی حوالے سے ایک خط ۲۴/ مارچ ۱۸۸۱ء کو **صادق الاخبار** میں شائع ہوا۔ اس خط میں مکتوب نگار نے **آبِ حیات** پر تبصرہ کیا ہے اور **آبِ حیات** میں مومن کا ترجمہ نہ شامل کرنے پر ان پر مذہبی تنگ نظری کا الزام بھی لگایا ہے۔[۳] اسی طرح کا ایک اور مضمون اخبار **صبحِ صادق** میں بھی شائع ہوا۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد حالی نے آزاد کو خط لکھا اور انھیں حوصلہ کرنے اور دل چھوٹا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ حالی نے آزاد کو لکھا کہ: ''یہ خیال اکثر حمقا کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصب کے سبب مومن کا حال نہیں لکھا، مگر اس سے بڑھ کر کوئی نحیف اور پوچ خیال نہیں ہوسکتا۔

دریا بوجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ یک کشاکش با اوست

آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے۔ من صنف فقد استھدف کا خیال رکھیے اور اپنا کام کیے جائیے۔ نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جاسکتے۔ اگر دو نکتہ چیں ہیں تو ہزار مداح اور ثنا گو بھی تو ہیں۔''[۴] اسی خط میں حالی نے ایک اور مضمون کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے: ''افسوس ہے کہ **سفیرِ ہند** امرتسر میں جو مومن کا حال چھپا ہے، وہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ صرف منشی ذکاء اللہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کسی شخص نے ایسا کچھ لکھا ہے۔''[۵] اس بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس اخبار میں بھی آزاد کی مخالفت میں کوئی مضمون شائع ہوا تھا۔ چونکہ حالی نے وہ مضمون خود نہیں دیکھا تھا، انھیں منشی ذکاء اللہ کی زبانی معلوم ہوا تھا، اس لیے گمان غالب ہے کہ انھیں ذکاء اللہ کی بات سمجھنے میں تسامح ہوا، یا منشی ذکاء اللہ نے خود وہ مضمون نہ پڑھا ہو اور کسی اور شخص کی زبانی اس مضمون سے متعلق سنا ہو اور جب حالی سے ملاقات ہوئی ہو تو بر سبیلِ تذکرہ اس مضمون کا تذکرہ بھی آیا ہو اور حالی ان کی بات کو پورے طور پر سمجھ نہ سکے ہوں۔ اس قیاس کو تقویت ذیل کے مضمون سے مل سکتی ہے۔ چونکہ حالی کے خط پر تاریخ درج نہیں، اس لیے اس خط کی حتمی تاریخ کا تعین تو نہیں کیا جاسکتا، البتہ خط کے مشمولات سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ خط **آبِ حیات** کی اشاعت اکتوبر، نومبر ۱۸۸۰ء کے بعد جب **آبِ حیات** کی حمایت اور مخالفت میں مضامین لکھے جا رہے تھے، انھیں دنوں میں لکھا گیا ہے۔ **آبِ حیات** لوگوں تک پہنچنے اور اس کے بارے میں ردِ عمل آنے میں کم از کم ڈیڑھ دو ماہ ضرور لگے ہوں گے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ: یہ خط غالباً دسمبر ۱۸۸۰ء کے آخری دنوں، یا جنوری ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا ہے۔ حالی جس مضمون کا حوالہ آزاد کے نام خط میں دے رہے ہیں، وہ مضمون **سفیرِ ہند** امرتسر میں دسمبر ۱۸۸۰ء یا جنوری ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا ہوگا اور غالباً یہ وہی مضمون ہے، جو ۲/ مارچ ۱۸۸۱ء کو **اودھ اخبار** کے صفحہ ۳۹۷۔۴۰۷ پر شائع ہوا۔ اس مضمون کو مدیر نے مضامینِ خاص میں شائع کیا ہے۔ **اودھ اخبار** کے اس شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس اخبار میں شائع ہونے سے قبل **پنجابی اخبار** لاہور میں اور اس سے بھی پہلے **سفیرِ ہند** امرتسر میں شائع ہو چکا تھا۔

گمان غالب ہے کہ یہ وہی مضمون ہے جس کا تذکرہ حالی نے منشی ذکاء اللہ کی زبانی سنا اور آزاد کے نام خط میں اس کا حوالہ دیا۔ اس مضمون میں کہیں بھی مصنف نے آزاد کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا اور نہ کسی جملے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ آزاد پر طنز کر رہے ہیں۔ چونکہ حالی نے وہ مضمون خود نہیں دیکھا تھا، اس لیے انھیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ **سفیرِ ہند** میں بھی آزاد کی مخالفت میں کوئی مضمون شائع ہوا ہے۔

اودھ اخبار لکھنؤ[۶] کی اشاعت ۲/ مارچ ۱۸۸۱ء میں **ملک الشعرا محمد مومن خان دہلوی کے حالاتِ زندگی** کے عنوان سے

ایک مضمون شائع ہوا۔ یہ مضمون اب تک کی دستیاب معلومات کی روشنی میں مومن کے حالات وکلام پر پہلا مضمون ہے۔ چونکہ اس سے قبل اتنی تفصیل سے مومن کے حالات وکلام پر کوئی مضمون نہیں لکھا گیا، اس لیے اسے مومن کے حوالے سے پہلا باضابطہ مضمون کہا جاسکتا ہے۔ **آبِ حیات** کی اشاعت ۱۸۸۰ء میں چونکہ مومن کا ترجمہ شامل نہیں تھا اور ہندوستان کے طول وعرض سے اس حوالے سے اعتراضات کے نشتر چلائے جارہے تھے۔ غالباً آزاد کی **آبِ حیات** میں مومن کا ترجمہ شامل نہ کرنے کے جواب میں یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ اگرچہ مضمون کی داخلی شہادتیں واضح انداز میں اس کا ثبوت تو پیش نہیں کرتیں، البتہ مضمون کی بعض عبارتیں آزاد کے اسلوب کی چغلی کھاتی ہیں، جن سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ یہ مضمون **آبِ حیات** کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔

ذیل کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیے: ''اب یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آپ کا قدرتی جوش جوفطرت نے اُن کے دماغ میں بھر دیا تھا، سیکڑوں اور ہزاروں رنگوں میں جلوہ گر ہوا۔ طبع کی جبلی موزونیت خود بخود ٹپکنے لگی۔ کبھی کبھی شعر کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ جب طبیعت اس ڈھنگ پر آ گئی کہ پوری غزل لکھ سکتے تھے تو شاہ نصیر کے شاگردوں میں جا داخل ہوئے، مگر استاد ابھی پوری اصلاح بھی نہ کرنے پائے تھے کہ شاگرد بگڑ کھڑا ہوا اور اُس کی طبعِ دشوار پسند نے یہ اجازت نہ دی کہ اُس شخص سے اصلاح کا خواستگار ہو جس کا طرزِ کلام اُس کی روش سے بالکل مخالف تھا۔ چنانچہ دو غزلیں ہی دکھا چکے تھے کہ اُستاد کی اُستادی کو فاتحہ پڑھی۔''

''اب عین شباب کا عالم تھا۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ جی میں ہزاروں اُمنگیں بھری پڑی تھیں۔ زبانِ خلق کے سوا کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا اور اُن امور کے ارتکاب کی ترغیبیں ہو رہی تھیں، جنھیں بڑھاپا ہزار آرزوؤں سے روکتا ہے۔ اس جنگ وجدل میں حکیم صاحب جیسا کہ چاہیے، فتح یاب نہ ہو سکے اور وہ کچھ انھیں پر نہ تھا، بلکہ اس قسم کی لغزشیں ہر ایک کو پیش آتی ہیں۔ اُن کی مفصل تشریح ظاہراً لاحاصل، بلکہ نامناسب ہے۔ اُس زمانے میں اُن کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی۔ لوگ عزت اور فخر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ میر و میرزا کے عالم آنکھوں میں پھرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دور دور کے مقامات کے صاحبِ ذوق بھی اپنی غزلیں اصلاح کی نظر سے بھیجنے لگے اور شہر میں بھی جس طرف سے نکل گئے، انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ یہ جوانی کا عالم، اس پر عاشق مزاجی اور قہرِ فکرِ روزی سے غافل، بلکہ بے پروا طبیعت کو وہ توڑ توڑ کر لڑانے لگے کہ نکتہ سنجوں کی آنکھیں کھل گئیں اور مشقِ سخن کہیں کی کہیں پہونچ [پہنچ] گئی۔ بڑے بوڑھوں نے شاگردیاں اختیار کیں۔ کہیں مشاقوں نے آن کر قدم لیے۔ ذوق اور غالب جیسے ہم عصر اپنا ہم پلہ سمجھنے لگے۔''

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات کا بغور مطالعہ کیجیے۔ ان اقتباسات پر آزاد کے اسلوب کا گمان ہوتا ہے۔ اگر کسی کو اس مضمون کے بارے میں معلوم نہ ہو تو وہ اسے آزاد کی تحریر ہی سمجھے گا۔ غالباً **آبِ حیات** کی اشاعت کے بعد جب علمی وادبی حلقوں میں چہ مگوئیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور اعتراضات کی خشمگیں آنکھیں آزاد کی طرف اُٹھنے لگیں تو اس مضمون نے رختِ سفر باندھا اور اخبارات کے دروازوں پر دستک دینے لگا۔ مندرجہ ذیل مضمون پہلی مرتبہ پنجابی **اخبار** لاہور میں شائع ہوا۔ شاید یہ بھی آزاد کی **آبِ حیات** کا جواب ہو کہ **آبِ حیات** کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں لاہور ہی سے شائع ہوا۔ آج تحقیقی حوالے سے تو اس مضمون کی خاص اہمیت نہیں۔ البتہ **آبِ حیات** کی دوسری اشاعت ۱۸۸۳ء میں آزاد کے اس بیان کے تناظر میں ضرور اہمیت بنتی ہے جس میں انھوں نے مومن کے حالات نہ ملنے کا عذر تراشا ہے۔ آزاد **آبِ حیات** کی دوسری اشاعت مطبوعہ ۱۸۸۳ء میں مومن کے ترجمے میں لکھتے ہیں: ''پہلی دفعہ اس نسخہ [نسخے] میں خان صاحب کا حال نہ لکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ دورِ پنجم جس سے ان کا تعلق ہے، بلکہ دورِ سوم و چہارم کو بھی اہلِ

نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں۔ کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو، جو اہلِ محفل کے لیے حاصل ہے، نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ خان موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اپنے وطن کے اہلِ کمال کا شمار بڑھا کر اور ان کے کمالات دکھا کر ضرور چہرۂ فخر کا رنگ چمکاتا، لیکن میں نے ترتیبِ کتاب کے دنوں میں اکثر اہلِ وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے۔ وہاں سے جوابِ صاف آیا۔ وہ خط بھی موجود ہیں۔ مجبوراً ان کا حال قلم انداز کیا۔''[۷] مندرجہ بالا عبارت میں آزاد لکھ رہے ہیں کہ انھیں مومن سے متعلق مطلوبہ معلومات حاصل نہ ہوئیں، اس لیے **آبِ حیات** میں ان کا ترجمہ شامل نہیں کیا گیا۔ حالانکہ مومن کا تذکرہ آزاد کے تقریباً تمام معاصر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ آزاد خود دہلی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مومن کو کئی مشاعروں میں دیکھا بھی ہوگا اور ان سے ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔ آزاد کا خانوادہ دہلی کے معزز خانوادوں میں سے ایک تھا۔ ان کے اہلِ دہلی سے تعلقات بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ پھر اس طرح کا عذر پیش کرنا حیران کن امر ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے آزاد اور مومن پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے: ''محمد حسین آزاد شاہ جہان آباد دہلی میں مومن کے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہ رہتے تھے۔ **آبِ حیات** کی تالیف کے وقت دہلی میں ایسے لوگوں کی خاص تعداد موجود تھی جو ذاتی طور پر مومن کو جانتے تھے اور ان کے حالات بتا سکتے تھے۔ **دیوانِ مومن** چھپا ہوا موجود تھا۔ جب حالی کو یہ عذر معلوم ہوا تو انھوں نے مومن خان کے سوانحی حالات، ان کے فنی محاسن پر ناقدانہ تبصرہ اور انتخابِ کلام تیار کر محمد حسین آزاد کو بھیجا۔ اب ان کے لیے کوئی بہانہ باقی نہ رہا اور دوسرے ایڈیشن میں مومن بھی بادلِ نخواستہ شامل کر لیے گئے۔''[۸]

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ آزاد نے **آبِ حیات** کی تصنیف میں بڑی محنت صرف کی۔ دورِ اول، دوم، سوم، چہارم اور پنجم میں شامل شعرا کے حالات و کلام کو حاصل کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں اپنی آنکھوں کا تیل ٹپکایا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''**آبِ حیات** نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بے وقوفی ہوئی۔ دس مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں کیا۔''[۹]، لیکن مومن جو اُن کے معاصر شاعر تھے، ان کے حوالے سے لکھ رہے ہیں کہ حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ **آبِ حیات** کو تصنیف کرتے ہوئے انھیں جان توڑ محنت کرنا پڑی اور اپنی زندگی کے آخری سالوں میں، جن ذہنی مسائل کا انھیں سامنا کرنا پڑا، اس کا ایک سبب **آبِ حیات** بھی تھی۔ پھر وہ کیا اسباب تھے؟ جن کی وجہ سے آزاد نے مومن کا ترجمہ **آبِ حیات** میں شامل نہیں کیا۔ اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔ بہر حال ایسے وقت میں جب آزاد، مومن کے حالات کے حوالے سے مذکورہ بالا بیان لکھ رہے ہیں، اس وقت اس مضمون کی اشاعت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ **اودھ اخبار** میں اس مضمون کے مصنف کا نام تحریر نہیں۔ تاہم اس مضمون کو مضامینِ خاص میں شامل کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی ادبی صورتِ حال کے تناظر میں اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ملک الشعرا حکیم محمد مومن خان دہلوی کے حالاتِ زندگی

حکیم محمد مومن خان دہلوی کی سوانح عمری جو **سفیرِ ہند** نے شائع کی تھی اور اب **پنجابی اخبار** لاہور نے طبع کی۔ ہم بھی اُس کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

حکیم صاحب ۱۲۲۴ ہجری میں خاص شاہ جہان آباد میں پیدا ہوئے۔[۱۰] اُن کے والد حکیم غلام نبی خان اُس زمانے میں دہلی کے مشہور طبیبوں میں سے تھے۔ اُن کا سلسلۂ نسب کیومرث اور کیقباد سے ملتا ہے جس کا وہ خود ہی ایک فارسی کے قصیدے میں، جو اُنھوں نے عرفی کے جواب میں لکھا ہے، ان لفظوں میں ذکر کرتے ہیں:

گر یک یک از آبا شمرم تا بہ کیومرث
آں کیست کہ تا چرخ بنفراشت علم را[۱۱]

اوران بزرگوں کا طریقِ تمدن سارے عالم پر روشن ہے،مگر زمانے کے انقلابوں کے باعث کوئی دس بیس پشتوں سے ان کا یہی شریف پیشہ قدیم ہو چکا تھا۔حکیم غلام نبی خان کچھ تو بباعث اپنی ذاتی لیاقت اور کچھ بوجہٴ خاندانی اعزاز اور رسوخ کے دہلی کے منتخب آدمیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔حکمائے شاہی میں داخل تھے[۱۲] اور نسبتہً اپنے ہم چشموں میں مؤقر وممتاز تھے۔

مومن خان جب پانچ چھے برس کے ہوئے تو حسبِ دستور مکتب میں بٹھائے گئے۔طبیعت تو خدا نے پہلے ہی مناسب بنا رکھی تھی، چند ہی دنوں میں اس کا اثر ظاہر ہونے لگا۔چنانچہ تیرہ برس کی عمر میں فارسی وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے اِدھر تو اپنے والدِ بزرگوار سے حکمت کا درس اور اُدھر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی خدمت میں عربی کا سبق شروع کر دیا۔[۱۳] (یہ وہی مولوی اسمٰعیل صاحب ہیں، جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے اور ہندوستان کے موحدین کے بانی تھے اور جو اپنے عصر میں علمِ حدیث اور معقول میں اپنا جواب آپ ہی تھے اور جو آخر کو پشاور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے ہاتھ سے شہید ہوئے تھے۔)

اب یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آپ کا قدرتی جوش جو فطرت نے اُن کے دماغ میں بھر دیا تھا،سیکڑوں اور ہزاروں رنگوں میں جلوہ گر ہوا۔طبع کی جبلی موزونیت خود بخود ٹپکنے لگی۔کبھی کبھی شعر کہنے لگے۔رفتہ رفتہ جب طبیعت اس ڈھنگ پر آ گئی کہ پوری غزل لکھ سکتے تھے تو شاہ نصیر کے شاگردوں میں جا داخل ہوئے[۱۴]،مگر استاد ابھی پوری اصلاح بھی نہ کرنے پائے تھے کہ شاگرد بگڑ کھڑا ہوا اور اُس کی طبعِ دشوار پسند نے یہ اجازت نہ دی کہ اُس شخص سے اصلاح کا خواستگار ہو جس کا طرزِ کلام اُس کی روش سے بالکل مخالف تھا۔چنانچہ دو غزلیں ہی دکھا چکے تھے کہ اُستاد کی اُستادی کو فاتحہ پڑھی۔

اسی زمانے کی ایک مثنوی میں اپنی ہی دل بستگی کے حالات کا مرقع کھینچا ہے[۱۵]،جو اَب تک اُن کے دیوان میں موجود ہے اور جس کے آخر میں خود ہی اپنی عمر کی طرف اس شعر میں اشارہ کر گئے ہیں:

دیکھیں آگے دکھائیں کیا کیا دن
ہے ابھی سترہ برس کا سِن[۱۶]

ابھی شاعری کی ابتدا ہی تھی اور اُستادی کا غلغلہ بلند آوازہ تک نہ ہوا تھا کہ سر پر سے سایۂ پدری اُٹھ گیا جس کی لاجواب تاریخ اُنھوں نے خود ہی قرآن کی اس آیت سے نکالی: قد فاز فوزاً عظیماً ۔[۱۷]

جب اُنیس برس کی عمر ہوئی تو تعلیم سے فارغ ہوئے اور انھی مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے فاتحۂ فراغ پڑھی اور اُنھیں کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی[۱۸] جس سے صاف ظاہر ہے کہ حکیم صاحب زمرۂ موحدین میں سے تھے۔چنانچہ اُن کے ذیل کے اشعار سے اُن کی پیروی معلوم ہو سکتی ہے:

رباعی

اربابِ حدیث کا میں فرمان بر ہوں
تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبولِ روایت ائمہ نہ قیاس
یعنی کہ فقط مطیعِ پیغمبر ہوں

ایضاً

یہ کچھ رہِ سنت نہ طریقِ توحید
پھر کیا ہی ضرور ہے سب کی یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنیِ حقیقی یعنی
حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید [۱۹]

اورایک غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں:

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم[۲۰]

اسی طرح بہت جگہ ذکر کیا ہے، جس کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے۔

اب عین شباب کا عالم تھا۔طبیعت زوروں پر تھی۔جی میں ہزاروں اُمنگیں بھری پڑی تھیں۔زبانِ خلق کے سوا کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا اور اُن امور کے ارتکاب کی ترغیبیں ہورہی تھیں، جنھیں بڑھاپا ہزار آرزوؤں سے روکتا ہے۔اس جنگ وجدل میں حکیم صاحب جیسا کہ چاہیے، فتح یاب نہ ہوسکے اور وہ کچھ انھیں پر نہ تھا، بلکہ اس قسم کی لغزشیں ہر ایک کو پیش آتی ہیں۔اُن کی مفصل تشریح ظاہراً لاحاصل، بلکہ نامناسب ہے۔اُس زمانے میں اُن کی شہرت عالمگیر ہوچکی تھی۔لوگ عزت اور فخر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔میر ومیرزا کے عالم آنکھوں میں پھرنے لگے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ دور دور کے مقامات کے صاحبِ ذوق بھی اپنی غزلیں اصلاح کی نظر سے بھیجنے لگے اور شہر میں بھی جس طرف سے نکل گئے، انگلیاں اُٹھنے لگیں۔یہ جوانی کا عالم، اس پر عاشق مزاجی اور قہر فکرِ روزی سے غافل، بلکہ بے پرواطبیعت کو وہ توڑ توڑ کر لڑانے لگے کہ نکتہ سنجوں کی آنکھیں کھل گئیں اور مشقِ سخن کہیں کی کہیں پہونچ [پہنچ] گئی۔بڑے بوڑھوں نے شاگردیاں اختیار کیں۔کہیں مشاقوں نے آن کر قدم لیے۔ذوق اور غالب جیسے ہم عصر اپنا ہم پلہ سمجھنے لگے۔انتیس برس کی عمر تھی، جب اُن کی معشوقہ کا انتقال ہوا۔اُس کا مرثیہ لکھا جو دیوان میں موجود ہے۔[۲۱] مرثیہ کے لکھنے کے بعد انھیں گویا ریختہ کی قسم ہوگئی تھی۔

رفتہ رفتہ اس سے اپنی طبیعت پھیرنے لگے، حتیٰ کہ موت نے سب کچھ چھڑادیا۔اس مرثیہ [مرثیے] میں آپ نے وہ سوز وگداز کی داد دی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔حکیم صاحب کا اگرچہ سارا کلام ہی مرثیہ وسوز ہے، مگر یہ چونکہ خاص مرثیہ ہے اور اس میں خواہ مخواہ طبع کو اسی طرف لگانا پڑا تو گویا اُن کی اصلی غرض شاعری کو بڑی بھاری جرأت، بلکہ ترغیب حاصل ہوئی۔اس سے سراسر حضرت کی عاشق مزاجی ٹپکتی ہے اور اس خوبی سے آپ نے ایسے لوازم کو ادا کیا ہے کہ انسان کے دل سے بے اختیار یہی بات نکلتی ہے کہ آپ یا تو (پورے؟) مرثیہ گوئی کے مشاق تھے، یا کچھ جی پر ایسا ہی ستم گزرا تھا، جسے بدون اُس کے روک نہ سکے۔بات یہ ہے کہ اُستادی کے معنی بھی یہی ہیں کہ جس صنفِ کلام پر ہاتھ اُٹھائے، اسے اس انداز سے لکھے کہ سامعین کے دل میں یہی خیال ہو کہ یہی اُس کا خاص طرز ہے۔

ہم نمونے کے طور پر ایک بند اُس میں کا [کذا] ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور تھوڑے عرصہ [عرصے] کے لیے اُن کے رُلانے کا مصالح [کذا] تیار کرتے ہیں:

ویراں ہے خانہ جلوۂ حیرت طراز کا
آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا
ہاتھوں سے اپنے مہرۂ تریاک کھو دیا
بگڑا ہے کھیل کیا فلکِ حقہ باز کا

پہلے ہی اذنِ عام کہا نعشِ یار پر
غیرت سے انتظار نہ کھینچا نماز کا[۲۲]

سر پیٹتی ہیں حلقۂ ماتم میں قمریاں
نخلِ عزا ہے آہ یہ کس سروِ ناز کا
کب پہونچے باغِ خلد میں ہم سے گنہگار
ہے تنگ قافیہ ہوسِ ہرزہ تاز کا
زندہ ہی دفن کر دو مجھے دوستو کہ اب
محتاج کون ہو اجلِ بے نیاز کا
ہے کفر مت کہہ اب اسے کس سے وصال ہے
اے محرم آہ فائدہ افشائے راز کا
گستاخ نالے فتنۂ محشر جگائیں گے
خوابِ عدم میں چین ہے گر خوابِ ناز کا
گر گلشنِ خلیل جلا دے تو کیا عجب
شعلہ ہمارے سوزِ سمندر گداز کا
نادان دل کو مرگ کا اب تک یقیں نہیں
اللہ کیا گمان تھا عمرِ دراز کا
خود کام ہے عجب مجھے مر جانے کا ترے
کام آئے کیوں نہ تیرے لبِ جاں فزا ترے [۲۳]

اسی طرح اس مرثیہ کے بارہ بندوں کو اس مقطع پر ختم کرتے ہیں:

اے مرگ اس عذاب سے آ کر چھڑا مجھے
مومن ہوں قید خانہ ہے دارالفنا مجھے

بارہ بند کیا لکھے ہیں محتشم کاشی کا منہ پھیر دیا ہے۔ میرے بیان کی صداقت اُس وقت ہو، جب دونوں کا انصاف کی آنکھوں سے معائنہ ہو۔ علاوہ برایں ہجومِ غم کے ہاتھوں وہ دماغ بھی نہ رہا تھا۔ طبیعت کو اس بے وقت مرگ کے اندوہ نے ایسا گھیر لیا تھا کہ کسی کام کے نہ رہے۔ اپنے آپ کو پہچاننا دشوار ہو گیا تو شعر کہنا کہاں؟ ایسی حالت میں کبھی چھٹے چھ ماہے دوستوں اور شاگردوں کی بے حد درخواست اور آرزوؤں پر کچھ کہہ لیا کرتے تھے، ورنہ ریختہ گوئی سے گویا دراصل تائب ہی ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہو گا

جب یہ بات سارے شاگردوں اور دوستوں کو ظاہر ہونے لگی کہ آپ اب نظمِ ریختہ سے گویا ایک گونہ نفور ہو گئے ہیں تو پہلے پہل

جس نے اس اہم کام کا بیڑہ اُٹھایا، وہ حضرت کے دلی دوست اور رشید شاگرد نواب مصطفیٰ خان تخلص شیفتہ تھے۔ اُنھوں نے کمال دقت اور عرق ریزی سے، بہت پراگندہ اوراق کو جوشاگردوں، دوستوں اور عام لوگوں کے پاس تھے، یا زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے، فراہم کیا اور اسے دیوان کے قالب میں لائے، جو آج کل لوگوں کے پاس اُس عدم المثال کی چودہ برس کی کمائی ہے اور حقِ شاگردی ادا کیا[۲۴]، ورنہ یہ بھی یوں ہی جاتا اور اس باکمال کی بے نام ونشانی کا نوحہ بھی ہم کو کرنا پڑتا۔

حکیم صاحب علاوہ ریختہ گوئی کے فارسی کی نظم ونثر سے بھی عاری نہ تھے۔ نثر کی مثال تو وہی نواب مصطفیٰ خان بہادر کے تذکرہ **گلشنِ بے خار** پر جو اُنھوں نے تقریظاً لکھی ہے، گواہ ہے اور نظم کے بارے میں ایک ضخیم دیوان چھوڑ گئے ہیں، جو تلاش کرنے پر مل سکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کو فارسی کی شاعری میں وہ عروج حاصل نہیں ہوا، جو اردو میں قسامِ ازل نے اُن کے حصے میں لکھا تھا، مگر اس میں بھی کسی کافر کو کلام نہیں کہ اپنے ہم عصروں میں پھر بھی بہت اعلیٰ درجے پر تھے۔ چند مثالیں ذیل میں صداقت کے لیے کافی ہیں:

دل ربودند و بہ دلدار نشانم دادند [۲۵]
آنچہ بردند زمن بہتر از آنم دادند

ہم تاب وصل نیست منِ بے نصیب را
خود دشمنِ خودم نہ شناسم رقیب را

پامالِ ندامت شدم از طعنۂ بلبل
دیگر نہ زنی گل بسرِ خود بسرِ خود

تفصیل را ستم کشِ ایجاز می کنم
یک حرف می نویسم و صد ناز می کنم

با کفروآستانِ کلیسا ترا چہ کار
مومن بدیں بہانہ نشستن برائے کیست

مُردم و مشکلش آساں کردم
رحم بر بازوے جاناں کردم

پے بردہ ام ز کثرت ہم بزمی مسیح
جان میدھد بر آن لب جان پرورآفتاب

رباعی

مومن چہ شدت کہ رنگ زردے داری
دل سوختہ ء کہ آہ سردے داری
ایں نالہ دل گداز جز چیزے نیست
دردے داری و سخت دردے داری [۲۶]

ایضاً

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دھر
ریزد ھمہ دُرددرد و تلخابۂ زھر
بگزرز سعادت و نحوست کہ مرا
ناھید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

چوالیس برس کی عمر تھی کہ مرض الموت لاحق حال ہوا اور مدت تک بسترِ رنجوری پر لٹایا اور ایسے پڑے کہ مر کر اُٹھے۔ انتقال سے تین دن پہلے جب مولوی عبدالرحمٰن صاحب خلفِ میر محمد تسکین نے، جو حضرت کے پسر خواندہ تھے، دیوانِ ریختہ جو انھوں نے نواب صاحب والے دیوان پر ایزاد کیا تھا، تمامہ پڑھ کر سنایا تو آپ کی زبان سے یہ مصرع نکلا:

حوالت با خدا کردیم و رفتیم [۲۷]

غرض کہ ۱۲۶۸ھ میں آپ نے اس جہان کو چھوڑا۔ [۲۸] تاریخیں تو آپ کے انتقال کی بہت ہوئی ہیں، مگر ایک تاریخ یہاں تمثیلاً کفایت ہے:

چوں عقل نمود پے ز خود گم
از صدمۂ جاں گزاے مومن
نہ چرخ زدند بیخودانہ
نہ صدائے ھائے مومن [۲۹]

اس میں تو خیر کچھ دقت بھی پڑتی ہوگی، ماتمِ مومن خان [۳۰] میں صاف عدد نکل آتے ہیں۔

سلطان جی میں مدفون ہوئے [۳۱]، پھر بعد کو وہیں مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ اور مفتی محمد صدرالدین علی خان بہادر بھی جو اُن کے بڑے یار تھے، آ پہنچے۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ گنجِ شہیداں دیکھ چکا ہوں۔ سچ پوچھو تو بادشاہوں کی قبروں پر وہ تأسف نہیں آتا، جو اِن باکمالوں کی قبروں پر آتا ہے۔ حیف کہ کسی وارث کو یہ نہ سوجھا کہ آپ کا یہ شعر قبر پر کندہ کر دیتا:

سنگِ مرقد سے مرے فیض ہے سب کو مومن
ہوں تہِ خاک بھی طوطی پسِ آئینہ

حوالے اور حواشی:

۱۔ دیکھیے: **آبِ حیات**: محمد حسین آزاد مرتبہ ابرار عبدالسلام: شعبۂ اردو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان: مارچ ۲۰۰۶ء: ص ۲۸۳۔

۲۔تفصیل کے لیے دیکھیے: **آبِ حیات** کا سالِ اشاعت: ابرار عبدالسلام :**غالب** مجلّہ ادارۂ یادگارِ غالب ،کراچی: شمارہ نمبر ۲۱: ۲۰۱۳ء: ص ۱۶۸و۱۶۹۔

۳۔**صادق الاخبار** میں **آبِ حیات** میں مومن کا ترجمہ نہ شامل کرنے پر آزاد پر متعصب شیعہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔اس مضمون کا ایک اقتباس دیکھیے: ''ایک ایسے جواہر زواہر کو خزف ریزہ جان کر پھینک دیا اور اپنی کتاب **آبِ حیات** میں جو اُن کے خیال میں ہوگی، دیگر شعرائے قدیم کے ساتھ نہ لکھا۔ حضرت آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔اجتماعِ ضدین کہیں بھی ہوسکتا ہے؟۔۔۔مومن تو نام پایا اور مذہب سنی کہ اصحاب ثلثہ کرام کی تعریف وتوصیف میں قصائد بھی لکھے اور وہ ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہوئے۔مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے جنتی مومن کا حالِ زندگی لکھ کر اس کو زمرۂ استادان میں شمار کر کر آپ بھی اسی کے پیرو ہوتے اور اپنی برادری میں خارج کیے جاتے اور اہلِ تشیع کی نظروں میں سبک بنتے۔پس آپ صبر کریں اور تعصب کی شان کو بغور تکتے رہیں۔فرمایئے تو سہی، جن شعرا کا ذکر **آبِ حیات** میں ہے، ان میں سے کسی نے ایک رباعی بھی اصحابِ ثلثۂ کبار کی شان میں کہی ہے؟ گو ان میں سے اکثر اہلِ سنت ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مومن مرحوم کو عشقِ مذہبِ تسنن اس امر کا مقتضی نہ ہوا کہ وہ اس غیر کتاب میں داخل ہوتا۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے: **محمد حسین آزاد۔احوال وآثار**: ڈاکٹر محمد صادق: مجلس ترقیِ ادب، لاہور: ۱۹۷۶ء: ص ۸۸۔

۴۔دیکھیے: مکتوبِ حالی بنام مولانا محمد حسین آزاد مشمولہ **محمد حسین آزاد** مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی: نشریات، لاہور: ۲۰۱۱ء: ص ۴۷۔

۵۔دیکھیے: ایضاً: ص ۴۷۔

۶۔۱۸۵۷ء کے بعد جن اخباروں نے شہرت حاصل کی، اُن میں سرِ فہرست نام **اودھ اخبار** کا ہے۔اس کے مالک منشی نولکشور تھے۔۱۸۵۷ء کی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہوئے تو منشی نولکشور لکھنؤ آ گئے۔لکھنؤ آنے سے قبل وہ چار سال تک کوہِ نور پریس لاہور میں کام کرتے رہے۔لکھنؤ آنے کے بعد انھوں نے مقامی حکام سے مل کر کوٹھی غالب جنگ میں مطبع نولکشور کے نام سے ایک پریس قائم کیا اور محلّہ حضرت جنگ سے جنوری ۱۸۵۹ء کو **اودھ اخبار** کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔تھوڑے ہی عرصے میں اس اخبار نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ملک بھر میں سچی، صحیح اور تازہ خبریں دینے کے لیے **اودھ اخبار** مشہور ہو گیا۔اس کے نامہ نگار تمام صوبوں اور ریاستوں میں پھیلے ہوئے تھے۔مشہور تھا کہ ہندوستان کی مختلف راجدھانیوں میں یا تو حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا منشی نولکشور کے۔ابتدا میں **اودھ اخبار** کی کوئی پالیسی نہیں تھی۔ یہ اُن خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تاروں اور نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں۔بعد میں اس نے اپنی پالیسی بنائی، جس کا مقصد اردو ادب کی خدمت کرنا، تباہ کن اور ضرر رساں رسم ورواج سے قوم کو بچانا، اصلاحی ادبی جماعتوں اور تعلیمی اداروں کا پراپیگنڈہ کرنا اس کا شعار تھا۔اس اخبار میں عصری حالات اور خبروں کے علاوہ جغرافیائی، علمی اور ادبی مضامین بھی چھپتے تھے۔اردو اور فارسی کی کتابوں، اخباروں اور رسالوں پر بے لاگ تبصرے بھی شائع کیے جاتے تھے۔مشہور شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔غالب اور غالب کے معاصرین اور متأخرین شعرا و ادبا کا کلام، حالات، وفات کی تاریخیں، مضامین، قطعاتِ تاریخ اور دیگر اخباروں سے حاصل شدہ مضامین اور اطلاعات کو اس اخبار کی زینت بنایا جاتا تھا۔

اودھ اخبار کے سب سے پہلے ایڈیٹر مولوی ہادی علی اشک تھے۔ان کے بعد افضل العلما مولوی فخر الدین فخر لکھنوی، مہدی حسن خان، مولوی غلام محمد خان تپش، پنڈت رتن ناتھ سرشار، راجہ شیو پرشاد، سید امجد علی اشہری، مولوی رونق علی افسوں، منشی طوطا رام شایاں اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔مذکورہ لوگوں کے علاوہ ہرگوپال تفتہ، مردان علی خان رعنا، عبدالحلیم شرر لکھنوی، جالب دہلوی، شوکت تھانوی، مرزا محمد عسکری اور پیارے لال شاکر وغیرہ حضرات نے اس اخبار کو اپنی علمی گل افشانیوں سے چار چاند لگا دیئے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے: (i) **اردو کے اخبار نویس**: امداد صابری: صابر اکیڈمی، دہلی: ۱۹۷۳ء (ii) **سوانح منشی نولکشور**: سید امیر حسن نورانی: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،

پٹنہ:۱۹۹۵ء(iii)**نولکشور اور ان کا عہد**: قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی وڈاکٹر وہاج الدین علوی (مرتبین): شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی:۲۰۰۴ء)۔

۷۔**آبِ حیات** مرتبہ ابرار عبدالسلام:ص۲۸۳۔

۸۔**کچھ مومن کے بارے میں** از نثار احمد فاروقی مشمولہ **غالب نامہ**: غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی: جنوری ۱۹۹۹ء:ص۲۱۱۔

۹۔**آبِ حیات** مرتبہ ابرار عبدالسلام:ص۶۱۵۔

۱۰۔شیفتہ نے **دیوانِ مومن** کے دیباچے میں ۱۲۴۳ھ میں ان کی عمر ۲۹ سال تحریر کی ہے۔ ’’و بہ زمانۂ کہ تہذیب ایں دل فریب بستان اتفاق افتاد از ہجرت ہزار و دو صد و چہل و سہ سال بروفق ہلال گشتہ بود و سنین عمرش کہ چوں عمر خضر از حد شمار بر کراں باد بہ بست و نہ رسیدہ‘‘۔(ص۴۸) **مثنوی شکایتِ ستم**،جس کا سالِ تکمیل ۱۲۳۱ھ ہے،مثنوی کے تاریخی نام ’شکایتِ ستم‘ سے اخذ ہوتا ہے:

ایں نالۂ شکایت ستم نام
با من خود گفت سالِ اتمام

اس مثنوی میں مومن اپنی عمر کے متعلق ایک شعر میں لکھتے ہیں:

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن
ہے ابھی سترہ برس کا سن (ص۳۷۰)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مومن ۱۲۱۵ھ کے اوائل یا اواخر میں پیدا ہوئے۔(ص۱۱۵)(تفصیل کے لیے دیکھیے:**کلیاتِ مومن**: مومن خان مومن:مجلس ترقیِ ادب،لاہور:بارِاول جولائی ۱۹۸۴ء)

۱۱۔کس نیست کہ تا چرخ نیفراشت علم را(**انشائے مومن** مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی:غالب اکیڈمی،نئی دہلی:مارچ ۱۹۷۷ء:ص۸۱)

۱۲۔کلب علی خاں فائق نے لکھا ہے کہ:حکیم غلام نبی خاں اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں سے نہیں تھے۔اگر وہ ہوتے تو سرسید احمد خان نے **آثارالصنادید** میں دہلی کے مشہور اطبا کے حالاتِ زندگی درج کیے ہیں،اس میں مومن کے چچا حکیم غلام حسن صاحب اور حکیم غلام حیدر خان کا ذکر کیا ہے۔مومن کے والد حکیم غلام نبی خان حکیم ضرور تھے،لیکن مشہور اطبا میں سے نہ تھے،ورنہ ان کا ذکر **آثارالصنادید** میں ضرور آتا۔خود مومن خان نے اپنے مرضِ عشق کے سلسلے میں اپنے چچا کے علاج کا بیان کیا ہے اور ان کی تشخیص کا ذکر ملتا ہے،اس لیے حکیم غلام نبی خان کو اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں شمار کرنا درست نہیں۔(**مومن۔حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر**:کلب علی خاں فائق رامپوری:مجلس ترقیِ ادب،لاہور: ۱۹۶۱ء:ص۲۱۔۲۴)

۱۳۔مولوی شاہ اسمٰعیل سے عربی پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں۔کلب علی خاں فائق نے لکھا ہے کہ:عربی کی ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شاہ عبدالعزیز سے استفادے کا ذکر کیا ہے۔(**مومن اور مطالعۂ مومن**: ڈاکٹر عبادت بریلوی: اردو دنیا، کراچی:نومبر ۱۹۶۱ء:ص۱۵۔۲۲)ڈاکٹر ابرار عبدالسلام کی توجہ اس جانب مبذول نہیں ہوئی کہ مضمون نگار نے شاہ اسمٰعیل کی جائے شہادت پشاور لکھی ہے،حالانکہ سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے وہ بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔(مدیر)

۱۴۔شاہ نصیر کی شاگردی کا تذکرہ کریم الدین نے **طبقات الشعرائے ہند** نساخ نے **سخنِ شعرا** اور صفیر بلگرامی نے **جلوۂ خضر** میں کیا ہے۔نساخ نے لکھا ہے کہ:ایک دو غزلوں کی اصلاح ان سے لی تھی۔(تفصیل کے لیے دیکھیے:**مومن خان مومن**:ظہیر احمد صدیقی:ص۱۲۳۔۱۲۵)

۱۵۔دل بستگی کا حال مثنوی **قولِ غمیں** (۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء) میں موجود ہے۔اس مثنوی کا ایک مصرع ہے:’تیرا عشق ہے صاحب جی سے‘(محولہ

بالا:ص۱۰۰)

۱۶۔دیکھیں آ گے دکھائے کیا کیا دن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(**کلیاتِ مومن**:ص۳۷۰) ہے ابھی سترہ برس کا سن ۔یہ **مثنوی شکایتِ ستم** کا شعر ہے، جس کا متن 'دیکھیں آ گے دکھائے کیا کیا' ۔۔۔ہے(۱۷۶) **مثنوی شکایتِ ستم** تاریخی نام ہے،جس سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

۱۷۔مذکورہ تاریخ سے۱۰۴+ ۸۸+ ۲۸۷+۱۰۱۲=۱۵۰۰،اعداد حاصل ہوتے ہیں۔یہ دراصل **قرآن** کی آیت ہے جو کاتب سے غلط کتابت ہو گئی ہے۔درست آیت قد فاز فوزاً عظیما ہے۔اس سے۱۰۴+ ۸۸+۹۴+۱۰۱۲=۱۳۰۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔یہ بھی تاریخ درست نہیں ہو سکتی کہ مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ میں ہو گیا تھا۔ دراصل اس تاریخ میں تخرجہ ہے۔ درست تاریخ یہ ہے۔ جنازہ اُٹھایا فرشتوں نے آہ ۔۔۔۔۔۔تو قد فاز فوزاً عظیما کہا۔ قد فاز فوزاً عظیما کے اعداد۱۰۴+ ۸۸+۹۴+۱۰۱۲=۱۳۰۷ھ برآمد ہوتے ہیں:اس میں جنازہ کے چھیاسٹھ(۶۶)اعداد منہا کرنے سے سالِ مطلوبہ۱۲۴۱ھ حاصل ہوتا ہے۔

۱۸۔مومن نے شاہ اسمٰعیل کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔جعفر علی خان اثر کا بیان ہے کہ: مولوی اسمٰعیل شہید،مومن خان کے پیر بھائی تھے۔خواجہ محمد نصیر ان کے خسر تھے اور رنج تخلص کرتے تھے۔وہ مزید لکھتے ہیں: صاحبِ **آبِ حیات** کو معلوم تھا کہ مومن شاہ سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔معلوم نہیں کیا سمجھ کر خواجہ محمد نصیر کا مرید لکھ دیا۔رنج کے تذکرے میں صاحبِ **طورِ کلیم** نے لکھا ہے کہ:"میر محمد نصیر محمدی خلفِ میر کلو نبیرہ و سجادہ نشینِ میر درد علیہ الرحمۃ مومن خاں باری نسبتِ خویش و دامادی داشت"۔(**حکیم مومن خان اور ان کی شاعری** :جعفر علی خاں اثر لکھنوی: **نگار**،لکھنؤ: جنوری ۱۹۲۸ء:ص۱۸)

۱۹۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں فہمید (**کلیاتِ مومن**:ص۱۸۷)

۲۰۔لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(نسخۂ نولکشور:ص۱۸۸،بحوالہ **کلیاتِ مومن**:ص۱۱۴)

۲۱۔اس مرثیہ کا نام 'مرثیہ معشوقۂ حورطلعت ملک شیم حسنے وصالہا فی جنت النعیم' ہے۔ظہیر نے مرثیے کا سالِ تصنیف ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء سے ۱۲۳۱ھ /۱۸۱۵ء کے درمیان قرار دیا ہے۔ جب ان کی عمر گیارہ سے سولہ برس کے مابین تھی۔ظہیر صدیقی کے بیان کے مطابق: **مثنوی شکایتِ ستم** ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء میں ملتا ہے۔(ص۳۲۰۔۳۲۳)اس خاتون کا نام امۃ الفاطمہ تھا۔ یہ پورب کی رہنے والی تھی۔شاعرہ تھی اور صاحب تخلص کرتی تھی۔اس کا ذکر عبدالحی بدایونی کے تذکرہ **شمیمِ سخن**،درگا پرشاد نادر نے **گلشنِ ناز**،فصیح الدین رنج نے **بہارستانِ ناز**،کریم الدین نے **طبقات الشعرا** اور قطب الدین باطن نے **گلستانِ بےخزاں** میں کیا ہے،لیکن انھوں نے اسے شاعرہ ماننے سے انکار کیا ہے۔(دیکھیے:**مومن خان مومن**: ظہیر احمد صدیقی:ص۱۰۰۔۳۰۱)ظہیر صدیقی نے ان کے پانچ معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔(ایضاً:ص۹۸۔۱۰۸)

۲۲۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیرت سے انتظار نہ دیکھا نماز کا (**کلیاتِ مومن**:ص۲۸۴)

۲۳۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کام آئے تیرے کیوں نہ لبِ جاں فزا ترے (**کلیاتِ مومن**:ص۲۸۵)

۲۴۔**کلیاتِ مومن**،مومن خاں مومن کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔اس کو سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ میں جمع کیا۔مومن نے خود اس پر نظر ثانی کی اور ترمیم اور اضافے کے بعد کلیات کی شکل دی۔اس کلیات کو کریم الدین نے ۱۸۴۶ء میں مطبع رفاہِ عام،دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔۱۸۵۲ء میں اس نسخے کو کنہیا لال نے محبِ ہند پریس دہلی اور ۱۸۵۵ء میں انڈین پنچ پریس، دہلی نے شائع کیا۔۱۸۷۴ء میں نولکشور نے لکھنؤ سے شائع کیا۔اس نسخے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے،جس کو عبدالرحمٰن آہی شاگردِ مومن نے ترتیب دیا تھا اور مومن کی بیماری کے زمانے میں ان سے خود تصحیح کروائی تھی۔اس کے بعد **کلیاتِ مومن** کے کئی نسخے شائع ہوئے۔**کلیاتِ مومن** کا اہم ترین نسخہ مولانا ضیاء

احمد بدایونی نے مرتب کر کے انڈین پریس، الہ آباد سے شائع کیا۔ضیاء احمد بدایونی نے **قصائدِ مومن** کے نام سے ۱۹۲۵ء میں الناظر پریس سے قصائد کو الگ کر کے بھی شائع کروادیا تھا۔عرش گیاوی نے **حیاتِ مومن** میں کلامِ مومن کے ایک ایسے نسخے کا ذکر بھی کیا ہے جو ہنوز سامنے نہیں آسکا۔(**مومن اور مطالعۂ مومن**: عبادت بریلوی:ص۲۴۹۔۲۸۸اور **مومن خان مومن**: ظہیر احمد صدیقی:ص۱۲۵۔۱۲۶)

۲۵۔ دل گرفتند ز دلدار نشانم دادند_______________(**دیوانِ مومن فارسی**:ص۴۷)

۲۶۔ ایں نالۂ دل خراش بے دردے نیست______________(**انشائے مومن**:ص۵۰)

۲۷۔بندہ کمینہ از بدو صبا تا آخر عمر حضرت سابق الوصف در کنار عاطفت ایشان منظور نظر تربیت مانده و باوجود نسبت برادر زادگی علاقهء پسر خواندگی باآں جناب هم دارد فرصتِ وقت را که فی الحقیقت فرصت پروانهء محفل در آخر شب و فرصتِ مرغ چمن در آمد ز مهریر بیش نبود غنیمت شمردم و نسخه اے که بجهدِ بلیغ و سعی مو فور مطابق مجموعه فراهم آورده ء خواب معلیٰ القاب ها از بسیارے از غزلیات و رباعیات و مخمسات و مثنویات و افراد دیگر که بعد از ترتیب اولیں از صفحهء اندیشه بر لوح بیان ریخته بود بقلم خود نگاشته بودم ۔ از اول تا آخر بامید تصحیح و تقریر به نهج ترتیب خویش پیش گاہِ مصنف علیه الرحمة بر خواندم چنانچه پاره را به زیور اصلاح و حلیۂ تهذیب آراستند و پاره بحال خود گذاشتند و سه روز در وفات ایشاں باقی با مانده بود که دیوان تشریف تمامی در بر کشید و ایں مصرعه از زبان حال خان مغفور تراوش یافت۔ ؎ حوالت با خدا کردیم و رفتیم

اکنوں به جزم یقیں می تواں گفت که بعد ایں تدوین و ترتیب که مرةً بعد اولیٰ و ثانیا بعد اخرٰی برروئے کار آمده هر که بیروں ازیں سفینه بیتے از ابیات یا فردے از افراد از نتائج فکر صاحب دیوان نشان دهد۔ باید دانست که الحاقے بیش نیست(**کلیاتِ مومن**:ص ۵۱۔۵۲)اس کے بعد جو کلامِ مومن کا اس کے سوا پایا جائے، وہ اس کا کلام شمار نہ کیا جائے۔کلب علی خاں فائق نے نشاندہی کی ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۷۳ء میں پہلی بار شائع ہوا۔(**کلیاتِ مومن**:ص۱۱۰)

۲۸۔ یہاں غالباً کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔مومن کی وفات ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو ہوئی۔

۲۹۔ہائے مومن مادۂ تاریخ ہے، جس سے ۱۶+۱۳۶=۱۵۲ عدد حاصل ہوتے ہیں، جسے نو(۹) سے ضرب دینے سے ۱۳۶۸، اعداد حاصل ہوتے ہیں۔مومن کی تاریخِ وفات ۱۲۶۸ھ ہے، لیکن اس تاریخ سے ۱۳۶۸ھ برآمد ہو رہے ہیں۔سو(۱۰۰) کے عدد کس طرح کم ہوں گے؟ یہ معلوم نہیں ہوسکا۔

۳۰۔ماتمِ مومن خان سے ۴۸۱+۱۳۶+۶۵۱ = ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ مومن کا سالِ وفات ہے۔**گلستانِ سخن** جلد دوم مصنفہ مرزا قادر بخش صابر کے ص۳۹۲ پر مرقوم ہے کہ: یہ تاریخ اجودھیا پرشاد صبر نے کہی، جبکہ ضمیر الدین احمد عرش گیاوی نے **حیاتِ مومن** ص۸۲ میں یہ مادۂ تاریخ شاگردِ مومن آہی سے منسوب کیا ہے۔محمد حسین آزاد نے بھی یہ مادۂ تاریخ ان کے شاگرد کا تحریر کیا ہے، لیکن اس شاگرد کا نام تحریر نہیں کیا۔ (أ) **آبِ حیات**:ص۲۸۸ (أأ) **حیاتِ مومن**: ضمیر الدین عرش گیاوی، حسبِ فرمائش سید اشتیاق حسین بازار دریبہ کلاں دہلی: ۱۳۴۷ھ (أأأ) **گلستانِ سخن** جلد دوم: مرزا قادر بخش صابر مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی: مجلس ترقیِ ادب، لاہور: جون ۱۹۶۶ء)

۳۱۔مومن کی وصیت کے مطابق: ان کی میت کو دلی دروازے کے باہر منہدیوں میں شاہ ولی اللہ کے خاندانی قبرستان کے احاطے کے مغربی سمت دفنایا گیا۔مدتوں قبر بے نام و نشان رہی۔آخر ۱۹۴۳ء میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کی تحقیق و تحریک کے بعد پروفیسر سید احمد علی دہلوی نے

اس قبر کو پختہ کرا کے کتبہ لگوا دیا۔ درمیان میں ایک دفعہ سیلاب اور زلزلے کی وجہ سے قبر بے نام ونشان ہونے والی تھی، مگر مولانا آزاد میموریل سوسائٹی نے اس کو از سرِ نو پختہ کروا کے اس کے گرد احاطہ بنوا دیا۔ بعد میں جامعہ رحیمیہ نے اس کو سنگِ مرمر سے پختہ کروا کے قبروں کو اس احاطے میں لے لیا، جہاں شاہ ولی اللہ کے خاندان کے مزارات ہیں۔ (**مومن خان مومن**: ظہیر احمد صدیقی: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی: اول ۱۹۸۵ء: ص ۳۲۔۳۳)[بستی رحیمیہ کے قبرستان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کی قبریں ایک مستطیل نما کمرے کے احاطے میں ہیں۔ اس کمرے میں شمال کی طرف سے داخل ہونے کا راستہ ہے۔ مغرب کی طرف بھی ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے سے باہر نکلیں تو سیدھے ہاتھ اس احاطے کی دیوار سے متصل پہلی قبر مومن خان کی ہے۔ یہ قبر کسی احاطے میں نہیں، بلکہ اس سے باہر ہے۔ البتہ اس پر کتبہ ضرور نصب ہے۔ ۲۸/ فروری ۲۰۰۷ء میں راقم نے مومن خان مومن سمیت اس قبرستان میں مدفون دیگر علمی، ادبی اور روحانی شخصیات کی قبور کی زیارت کی۔ (مدیر)]